

”پترا رات مولانا صاحب خواب میں آتے تھے۔ کچھ پر لشان تھے مجھے فکر ہوتی کہ کیا یا
ہے۔ صحیح ہی قبرستان گیا۔ پترا پر فال تحریر پڑھی۔ قبری طبقہ ہے، اس کا بند و بست کرو۔“
”جی، بہت اچھا۔“

”میں نے گورکن سے کہا ہے کہ چالیس دن تک روز شام کو چراغ جلانا ہے موم ٹیوں
کا ایک سیکٹ یعنی دے آیا ہوں۔ فنا تم بھی تائید کرنا۔“
”جی، بہت اچھا۔“

”مولانا صاحب یعنی آدمی تھے، کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا۔ مجھے ان سے یہ یادی ڈھالیں
تھی۔ کہ اس کی جدائی میں دل یہے چین ہوتا تھا۔ تو ان کے پاس آ جاتا تھا۔ ایسی روایتیں،
حدیثیں سناتے تھے کہ دل کو قرار آ جاتا تھا۔“
”خواجہ صاحب، سلامت تو اگلی ہے۔“

”اس بارے تخم کوکس نے بلا یا تھا۔ حس کا انتظار ہے وہ آتا نہیں۔ جس کے جانے پر
خدا کا شکر ادا کیا تھا وہ پھر کے سینے پر موگ دلنے لگا۔ پترا اس کے وہی لپھن ہیں۔“
”مگر میں نے تو سما ہے کہ وہ اب نہ اپنے چھنے لگا ہے۔“

”ہاں پترا، خواجہ صاحب نے ہفتہ اسالش یعنی پہلے وہ ہمیں سو شلذم سکھا تھا،
اب اسلام پر ڈھارا ہے۔ اپنی ماں کو آج اسلام پر لکھر دے رہا تھا۔ وہ بولنے لگی تھی۔ میں
نے اسے روکا کہ نصیباں والی، اس ویلے تیرا پر نہیں میں ہے۔ جب ہوش میں آ جاوے
اس وقت اس سے بات کھویں ہوں، وہ ہوش میں کب ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ نیک بخت،
ہوش میں اس ویلے ہے کون۔ لوگوں نے آدھالک کھو دیا اور ہوش میں نہیں آتے۔
اس نے تو ایک بھائی ہی کھوایا ہے۔ پترا میں نے ٹھیک کہانا ہے؟“

”جی، آپ نے درست فرمایا۔“

”پترا لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔“ خواجہ صاحب کا لمحہ ایک دم سے بدال گیا۔

”کیا ہوا؟“

”جو ہو رہا ہے وہ تم دیکھ رہے ہو۔ آئے کیا ہو گا یہ پتہ نہیں لوگوں پر خون سوار ہے۔
پتہ نہیں کیا کہ میں گے۔ سماں کے گھروں پر نشان لگنے شروع ہو گئے ہیں۔“

”نشان؟ کیسے نشان؟“

”پتہ تو کس دنیا میں رہتا ہے۔ لٹاٹی کی تیاریاں ہیں۔ دونوں طرف اتنا گول بارود
جمع ہے کہ بس فیٹہ لگنے کی دیوار ہے۔ یہ شہر ایسا بھڑکے گا۔ جیسے سوکھا ہندھن دیا سالانی لگنے
پر بھڑکتے ہے۔ اللہ رحمہ ہی کہے۔ پھر کہ قریب آتے اور سرگوشی کے لیے میں کہا۔ پتہ
ایک بات بتا۔“

”جی“

”وہیسے تو پاکستان پر ولیوں کا سایہ ہے، پر بھی کبھی ڈر لگتا ہے۔ پاکستان پر کوئی آنکھ تو
نہیں آتے گی؟“

وہ اس سوال پر لوٹلا ساگیا۔ خواہ صاحب نے اس کی پرسنٹیشنی دیکھی۔ یوں ”کا کا!
بھی سوال میں نے مولانا صاحب سے کیا تھا۔ ہر سوال کا جواب وہ آیت حربیت سے دیتے
تھے۔ اس سوال پر چپ ہو گئے۔ ایسے چپ ہوتے کہ پھر ہمیشہ ہی کے لئے چب ہو گئے۔“

تعجبتی خطوط کے یون ہند وستان سے آیا ہوا ایک خط۔ اسے یہ تو سریندر کا خط
ہے۔ اس نے عجلت سے لفاظ چاک کیا۔

”یار ذاکرہ امیں نے انگریز تھارے پتوں کا یہ ایس نہیں دیا تو اس کا کارن یہ ہے کہ
میں دلیں میں تھام لیتے سئے سے یورپ کے دلیسوں میں گھوم پھر رہا تھا۔ لوت کے
آیا تو تمہارے پرستے۔“

تمہاری ماتھا صایہ کی فیملی کی خیریت معلوم کرنے کے لئے یہ چلیں ہوں گی مگر صابرہ
کو بھی ان لوگوں کے بارے میں کوئی خبر نہیں مل سکی میں نے اس سے تمہارے پتروں کا
ذکر کیا۔ بولی کچھ نہیں، روپڑی میں چکر لگیا۔ ان دلوں میں بھی جب ڈھاکہ سے بُری بُری خبریں
آئیں ہی تھیں، میں نے اسے ہمیشہ شانت پایا۔ مگر آج وہ روپڑی میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔
مگر میں اسے دیکھ کے دکھی ہوا۔ متبر ایک بات کہو؟ بُراست ماننا۔ تم ظالم آدمی ہو، یا
شاید پاکستان جا کر ہو گئے ہو۔“

تمہارا

نئی دہلی

سریندر

روپڑی ہو سوچ میں پڑ گیا۔ ماں اور بہن کی یاد آنسے پر روپڑنا بھی بات تو نہیں
ہے اور بالخصوص اسی حالت میں کہ ان کا اتنا پتا ہی نہیں ہے۔ زندہ ہیں یا مر گئیں۔ یہ توجیہ
اسے بہت معمول نظر آتی۔ مگر فوراً ہی اس سے یہ چیزیں سی ہونے لگی جیسے یہ توجیہ ناکافی ہو۔
میرے خطوں کا سن کمر روپڑی اکیوں؟ میں ظالم؟ وہ کیسے؟

بامہر مدد اس سے پر دشک ہوتی۔ اس نے جا کر دیکھا۔ افضل کھڑا تھا۔

”دوست، یہ وقت آئنے کے لئے مجھے معاف نہیں۔“

”کمال ہے، تم بھی وقت اور یہ وقت کے قاتل ہو گئے۔“

”میں تو نہیں ہوں، میرے لئے سب وقت ایک وقت ہیں، مگر تیرے تو اوقات

ہیں۔“

”بخوبی ہے، یہی گی بے چارگی میں اوقات کا کچھ نہ کچھ تو لحاظ رکھنا، ہی پڑتا ہے

خیر پھوڑ واس ذکر کو۔“

”پوچھنا چاہتے ہو، میں اس وقت کیوں آیا بیمار اکیلے میں مجھے خفغان ہونے لگا تو

میں تکل کھڑا ہوا۔ آج میں ڈلا ہوا ہوتا ہوں۔“

”ڈسے ہوئے کیوں؟“

”یاہ بمحض آوانیں سنائی دتیں میں۔“

”آوانیں کیسی آوانیں؟“

”بھی تو میری سمجھیں نہیں آتا۔ اپاٹک بین ڈالکہ کیس آندھی نہ چل پڑے اور کوئی پتھر نہیں آتے۔“

”کیا؟ کیا کہ رہے ہو؟ بہک گئے ہوتے؟“ اس نے افضل کو عونس سے دیکھا جو بہت دہشت زدہ نظر آ رہا تھا۔

افضل نے اس کی بات سنی کی کہنے لگا ”یہ صبح جب میں امتحانوں میں پھر کام آئیں کے پاس گیا اور اپنی صورت دیکھی کہ کہیں میں۔“

”فضل!“ اس نے بات کاٹنے ہوئے کہا ”تمہیں تو دوسرا کہہ لفڑتے ہیں۔“
”یاہ اپسابھی ہوتا ہے کہ آدمی دوسروں کو کہہ دے سمجھتے سمجھتے۔“ بس کسی صبح اسے پتہ چلتا ہے کہ خود اس کی ششکل پدل گئی ہے۔ مجھے کل پرسوں سے شک سا ہو رہا ہے کہ

کہیں میں بھی۔ کہیں میری ششکل۔۔۔؟“

”اچھا بکواس یہ کہہ دیا پلٹنگ ہے، اس پر لیٹر اور سوچا۔“

”دہاں یار،“ وہ فوراً ہی پلٹنگ پر جالیشاہ میں سونا چاہتا ہوں۔ ”یہ کہتے کہتے اندر گرد دیکھا، تعجب سے بولا ”یاد ایسا کہہ مجھے فار لگتا ہے۔“ رکا، سوچا، آہستہ سے کہا۔ ”میں بھی ہوت جاگا ہوا ہوں سات سو سال تک سوچوں کا!“ اور اسکیھیں اس کی مندرجی پلی گئیں۔

آوانیں، کہیں آدازیں؟ وہ بیڑا دیا۔ افضل کے توکان بجھتے میں چب ہو گیا اندر ہی اندر بول رہا تھا۔ یہ شخص دہموں میں زندہ ہے۔ روزا یک نیا وہم۔ یہ شخص ابھی تک بالغ نہیں ہوا ہے۔ سمجھتا ہے کہ وہ بچہ ہے اور اپنی ناتی کے ساتھ اپنے اُسی پرانے قبے

کی فضایں سانس لے رہا ہے، جماں ایسے ہی درخت ہوں گے جیسے ہمارے روپ نگر
میں تھے۔ روپ نگر، وہاں درخت ہی ایسے تھے جنہیں دیکھ کر ایسے وہم خواہ پیدا
ہوتے تھے اور وہ تصور ہی تصور میں روپ نگر میں جا پہنچا ریٹ کائیک دوپہری، کالے مندر
سے گزر کر، کہہ بلا کی طرف سے ہو کر وہ قلعہ کے پاس پہنچے۔ پھر اور آسے چلے چلتے چلے گئے۔
راون بن میں جا پہنچے چلتے چلتے ٹھنکے۔ دور فاصلہ پر بڑھ کا پیڑ دکھاتی ہے رہا تھا۔ راون بن
کے پیچ کھڑا ہوا اکتوتا پیر جیسے راون کھڑا ہو۔ پیر میں جیسے انہیں کچھ دکھاتی وسے رہا ہو۔
پھر جیب ڈری آواز میں یولا:

”باد ایہ آواز کیسی تھی؟“

”آواز“ بندوں نے جیرت سے جیب کی طرف ہو یکھا۔

”ابھی جو آتی تھی سو اکھر باتھے منانی دی تھی؟“

”وہ نہیں۔“

”سنوا،“ جیب نے ایسے کہا جیسے وہ پھر آواز سن رہا ہو۔
تینوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ چلچلاتی دھوپ میں کم سم کھڑے کان لگاتے کسی
دور کی ایجادی بھی آواز پر اُسے خود کچھ سناتی نہیں دیا۔ لگر جیب اور بندوں کے
چہروں پر مھپلیتی حیرت اور دہشت بتا رہی تھی۔ کہ انہوں نے کوئی آواز سنی ہے اور انہیں
ویکھ کر وہ بھی حیرت اور دہشت کے اثر میں آگیا۔

”بیجا لوگ۔“ جیب نے ایسے کہا جیسے آواز چل کر ان کے قریب آرہی ہوا اور دلوچ لینا
چاہتی ہو۔ اور وہ ان کے ساتھ ساتھ بھاگ کھڑا ہوا۔ بھاگنا چلا گیا، بھاگنا کر رہا۔ راون بن سے
والپی کا لے گوسوں کا سفر بن گئی آواز جیسے یونچے یونچے چلی آرہی ہو اور بیستی، اپنا لگھر، میلوں
دور ہو۔ ابھی تو کلامندر بھی دکھاتی نہیں دیا تھا۔ دکھاتی دیا تو اس طرح کہ جیسے افق کے
اس پار ہو۔ جیب اور بندوں کے نکل گئے تھے۔ وہ اکیلا یونچے رہ گیا تھا اور دوڑے

جاریا تھا۔ جیسے زمانہ گز ریگا ہوا ہو وہ دوڑھے جا رہا ہو۔ کب تک دوڑتا رہوں گا میر سانس پھولنے رکھا ہے اور طالگین تھک چکیں ہیں۔ تھکی ملائیں گوں اور بھولتے سانس کے ساتھ میں اس نرجس بن یں اکیلا دوڑ رہا ہوں۔ مگر کب تک؟ گھر لکتی دور ہے؟ دوڑ تک کوتی آدمی نظر نہیں آتا۔ دوڑتے دوڑتے اس کی ٹیکے پر نظر گئی۔ یہ آدمی ہے؟ اس کے جسم میں رعشہ دوڑ گیا اور پاؤں سوسو من کے ہو گئے۔ یہ آدمی ہے؟

افضال کے ایک اوپنچے فرائٹ نے اسے جیگا دیا یا چونکا دیا۔ وہ سو یا کہاں تھا؟ اس نے افضال پر ایک نظر ڈالی جو پے سدھ سو رہا تھا اور اوپنچے فرائٹ کے رہا تھا۔ یہ شخص واقعی سات سو سال تک سوتے گا۔ اس نے کہ سی پر بلیٹھے بلیٹھے جماں لی اور پر پر پڑایا۔ پھر سوچ میں ڈوب گیا۔ افضال نے ٹھیک کہا۔ ہاں واقعی یہ وقت لمبی نیتد لینے کا ہے۔ آدمی سب سے الگ کسی خاری میں جا کر سو رہے ہے یعنی اسے اسات سو سال تک۔ جب اُنھے اور فارسے باہر نکل کر دیکھے تو پرندے چلے کہ زمان بدال چکا ہے اور وہ نہیں بدلا ہے۔ اچھا ہے، اس سے اچھا ہے کہ روز صحیح اُنھوں کہ اس اندر لیش کے ساتھ آبیتہ دیکھے کہ اس کی صورت تو نہیں بدلتی گئی ہے۔ اور دن بھر پر وسوسرہ نہ اسے کہ شاید وہ بدال رہے ہے اور دگر لوگوں کو بدلتے دیکھ کر لیے ہی وسوسرے پیدا ہوتے ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوتی وسوسرے پیدا نہیں ہوتا اور پھر آدمی بدال جاتا ہے کیسے؟ کیسے وہ بدلتے چلتے گئے۔ وہ جن میں سے ہر شخص یہ سمجھ رہا تھا کہ دوسرے بدال رہے ہیں، اس کی شکل جوں کی توں ہے۔ ہر ایک نے ہر دوسرے کو دیکھا اور ششدراہ گیا۔

”عزیزہ! مجھے کیا ہو گیا؟“

”مجھے تو کچھ نہیں ہوا سمجھیں دیکھ رہا ہوں کہ مجھے کچھ ہو گیا ہے۔“

”عزیزہ، مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ مگر میں دیکھتا ہوں کہ تیری شکل۔۔۔“

ایک دوسرے کے ساتھ، دوسرے تیسرا کے ساتھ الجھنا چلا گیا۔ ایک نے دوسرے

کو بھینبھوڑا، دوسرا نے تیسرا کو بھینبھوڑا۔ سب ایک دوسرا کو بھینبھوڑ رہے تھے اور
بھروج اور سخن ہوتے چلے جا رہے تھے۔ میں ڈرائیکٹر میا دایں بھی — میں نکل کھڑا ہو لیجھے
اپنے غار میں جا کر سو جانا چاہئے سوتے رہتا چاہئے، یہاں تک کہ زیارت پبل جاتے یعنی میں
ہوں جھگل گھنہ ہوتا جا رہا ہے۔ کتنا گھنا، کتنا گھرا۔ اور یہ نگہدی؛ نہ شانتی کے شبد، نہ شردھاکی
ورشنا۔ بانسری کی رہرتان ٹوٹ پکی تھی۔ حکمتی دس کہیں نہیں تھا۔ جل ستمل اتمل چھل۔
زنانی بیاک۔ جنتاگھروں سے نکلی ہوئی۔ جیسے کوئی بھوپال میں گھرچوڑ کے بھاگے سد
چاریوں پر اپنائتے ہو رہا تھا۔ ساویتی ایسی استربوں کی سالیں یہ تھیں۔ سیندھ و سے
بھری ہائیں اجڑا رہی تھیں۔ بھری گودیں غالی ہو رہی تھیں۔ بالکوں کے مکنے ڈھلے تھے،
پتلی بھری تھیں۔ میں یہ چوچک کہ اس نگہدی کا رکھشک کہاں ہے؟ ایک چندا حماری نیچر گر جا؛
مورکھ، اس نگہدی کا رکھشک چگ نشانہ مار تھا پر اس نے یاں سے قبڑا اٹھایا اور جھگل
میں جا پہا جا۔

”کارن؟“

”کارن مت پوچھ دیکھے اور جان لے اور ایسا ہوا کہ گھوڑے اس کے یا گین تڑا کے
ہنہناتے ہوئے بن میں نکل گئے۔ یہ دیکھ وہ نداش ہوا۔ رخوس سے انڑکے بانسری کو گھر سے پہ
رکھ کے توڑا، گھر سے کوچھوڑا اور نندھوکوڑھوڑنا دھونیتا ہیں۔ میں نکل گیا۔“
یہ بنتا سن میں اس نگہدی سے نکلا۔ چلتے چلتے ایک بن کیا۔ نہ بن بن۔ اتحاد سناٹا۔ دیکھا
کہ ایک برکش تلے اس کا بندھواںگ بھیوت لے، امرگ چھال پہ بیٹھا ہے۔ چنائیں ایجھی
ہوئیں، آنکھیں موندی ہوئیں، منہ کھلا ہوا کہ بھیتسرے اس کا ایک سفید سانپ نے سڑکا لاء۔
چھپھننا ہوانکلا، لمبا ہونے لگا، ہوتا گیا، ہوتا گیا۔ اتنا ہوا کہ اس کے پھن نے دُر امنتہ
سالگہ کی لہروں کو جا چھوایا۔ نے ایک بھکے سامنہ دیکھا کہ وہ لمبا سفید سانپ منہ سے
اس گیانی کے زکلتا جا رہا تھا اور ساگہ میں اُستھا جا رہا تھا۔ پھریں نے دیکھا کہ دم اس سانپ کی

اس کے منہ سے نکل آئی ہے اور دم اس گیانی کا نکل چکا ہے۔

یہ دیکھ میں تے اپرچ گیا کہ ہے لام اسی میں کیا بھید ہے؟ اسی دم میں اُٹھ پاؤں پھرا کہ حاکر بتاؤں کہ دوار کا یا یسو! تمہارا پرکش مر رہے ہو، واں پر سائب ساگر میں اُٹھ گیا پر میرے پہنچنے سے پہلے ساگر کی امور واں پر پہنچ چکی تھیں۔ وہ تکمی کہ اس بھوساگر میں شانتی کا پر تھی، اب ساگر کی اندر گھمنڈا رہوں میں پہلے سماں دکھائی پڑتی تھی۔ سو جیشم نے کور و کلیت کے پہنچ پر ان بھوڑتے سے یہ دھشتر سے کہا کہ ہے یہ دھشتر پہلے پانی تھا کہ پانی ہی سے سب کچھ بناتے ہے اور جانا میں نہ کہ انت میں بھی پانی ہی ہے۔ ادیہ پانی، انت پانی۔ اوم شانتی شانتی۔

اس نے بھر بھری لی اور سوتے ہوئے سا بھی کو دیکھا جو جانو جنم جنم سے سورہ تھا، دنیا و ما قیما سے بے خبر بیسے اونچے خڑاؤں کے ساتھ۔ باہر غار سے جھانکا اور فرآ ہی سر اندر کر لیا کہ باہر سوت اندر ہیرا تھا اور اندر ہی بھی چلنے لگی تھی۔ بڑی طریقہ، ابھی تو بہت رات یا تھی۔ فتنہ کی رات کتنی بھی ہوتی ہے۔ سوتے ہوئے سا بھی کو دیکھا کس آرام سے سورہ ہے جب کہ باہر اندر ہی چل رہی ہے اور کب سے سورہ ہے۔ حالانکہ اس نے صرف سات سو یوں تک سوتے کی نیت کی تھی۔ مگر اب اس کے پوٹے بھی بھاری ہونے لگے تھے۔ لمبی جھاتی لیتے ہوئے بڑی طریقہ ایسا، اب سوتا چاہتے ہیں۔

”بیٹھے یہ چاہیوں کا گھٹا اسی طرح پڑا ہے۔“

اس نے چاہیوں کا گھٹا میز پر پڑا دیکھا اور شرم نہ ہوا۔ ابا جان نے آخری وقت میں کس اختیاط سے یہ گھٹا اس کے سپرد کیا تھا۔ ”امی آج طوفان سے اندر کو دوں گا۔“
”ہاں بیٹھے یہ باپ دادا کی امانت ہے ملے خفاظت سے رکھنا ہے،“ امی جان کشکشہ
کمر سے نکل گیئیں۔ آخر گھر میں اور کام بھی تو تھے۔

باپ دادا کی امانت، وہ بڑا بڑا ہے بیٹھے اسیں گھر کی چاہیاں ہیں جس پر اب تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔“ اس گھر کی اور اس زمین کی روپت نگر کی چاہیاں۔ چاہیاں یہاں ہیرے پاس ہیں اور وہاں ایک پورا زمانہ بن دیتے ہے، گزر ازانہ۔ گزر ازانہ گزر تماہیں ہے۔ گزر جاتا ہے پر نہیں گزرتا۔ اس پاس منڈلاتا رہتا ہے اور گھر کی چھال خالی نہیں رہتے۔ یکین چلے جاتے ہیں تو زمانہ ان میں بسانظر آتا ہے۔ روپت نگر کے کتنے خالی پولتے مکان اس کے تصویر میں پھر گئے۔
وہ بہری والا گھر، وہ جو مسجد والی گلی میں تھا اور جن کے صدر دروازے میں بڑا ساتا پانچ
تمانے پتہ نہیں اس گھر میں کون لوگ رہتے تھے اور کب تالا رکھا کرہ چلے گئے۔ اب تو ایک زمانے سے اس میں تالا پٹا ہوا تھا جس پر زندگ لگ گیا تھا اور اندر کئی کو ٹھہر لیوں کی
چھتیں گھم پڑی تھیں، بس دیواریں کھڑی رہ کئی تھیں اور جب ایک دوپہر کو وہ ایک
پنگ کا پیچا کرتے کرتے اس کی دیوار پر چڑھا تھا تو انہوں نے دیکھا جیسے بالکل خیل ہو۔

کتنی بھی بھی گھاس کھڑی تھی اور پہاڑ اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ آم کا چھوٹا سا پتیر نظر آتا تھا۔ خالی مکان بھل پڑے پڑے کس طرح جنگل بن جاتے ہیں اور زمانہ، زمانہ بھی اندبند رہ لے کہ جنگل بن جاتا ہے سیرا حافظہ میرا دشمن میرا دوست مجھے لے جا کر جنگل میں چھوڑ دیتا ہے۔

پلنگ ہے پچکدار سجن آبیو کہ جسا یتو

رتیا ہے مجھے دار سجن آبیو کہ جسا یتو

بینہ پر سے چلے جا رہا ہے۔ کہاں کہاں سے کس کس گھر سے اس بینہ پرستی رات میں ڈھوک کی آدا آتا تی چلی جا رہی ہے۔

«ذاکر، ہمارے لئے بھی قبر بنادے۔»

«میں کیوں بناؤں، خود بنائے۔»

صاحبہ خود گیسلی مٹی کھڑج کراپنے گورے پیر پر جاتی ہے اور پیر جب اُس کے اندر سے نکلتی ہے تو وہ اپنی کھکھل کے ساتھ قائم رہتا ہے۔

«ذاکر! میری قبر تیری قبر سے اپنی ہے۔»

«اجھی ماری؟»

«اپنا پاؤں اس میں ڈال کے دیکھ لے۔»

صاحبہ کے گورے نہم پیر کے ساتھ پرسنی ہوتی قیر، اس میں میرا پاؤں۔ کتنی نرم؟

کتنی خنک؟

«رذاکر بیٹی! اس سے کچھ سنا، تندور والی کے پوت کے گولی لگ کری۔»

«گولی لگ کری کیسے؟» اس نے چونک کہ اسی کو دیکھا جو سنت کھجرا تی ہوتی

اس کے کمرے میں داخل ہوتی تھیں۔

«ار سے ملے میں توحش اٹھا ہوا ہے۔ غریب کا ایک ہی پوت تھا۔»

«کس نے ماری؟»

«کس نے؟ کوئی ایک ہوت تو کسی کا نام لے ملے والے کہہ رہے ہیں کہ مال روٹ پر گولیوں کا بینہ برس رہا ہے۔ اسے لوگوں کے سر پر تو خون سوار ہے۔ جزو ہو رہے ہیں۔ جھلا تباوگہ تندور والی کے پوت نے ان کا کیا بگاڑا تھا۔»

گولیوں کا بینہ، وہ بڑی طریقہ ایسا۔ باہر گولیوں کا بینہ بس رہا تھا اور اندر وہ جنگلوں میں چھکتا پھر رہا تھا، پھر جنگل۔ وہ بڑھتا جا رہا تھا اور جنگل گھنے ہوتے جا رہے تھے۔ یہ میں کوئی جنگل میں ہوں۔ کتنا گھنا، کتنا آگرا۔ اور یہ نگہم۔

«اُسے ذاکرہ، اسے کچھ سنا اب آگ لگ گئی۔» امی نے کمرے میں قدم رکھتے ہوئے دیشست جھرمی آواز میں کہا۔

«ہمگی؟» اس نے جنگلوں سے واپس آتے ہوئے امی کو دیکھا «کہاں آگ لگ گئی؟»
«وہ ہے نہیں گھوڑوں والوں کی کوئی میں اُن ناس پیٹوں کا دفتر۔ وہ کون سی پارٹی ہے
بیری یاد پہ تو پھر پڑکتے اور آرٹیوں پارٹیوں کے نام تو بالکل یاد نہیں رہتے۔»

«مھیک ہے۔ ان کے نام یاد رکھنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔»

«ملے والیوں نے تو مجھے بولا دیا۔ کہتی ہیں باہر کچھ ہوا کہے تمیں کیا یہ میں تجھے آج

«امی باہر کچھ نہیں ہو رہا، آپ الحینان سے بیٹھیں۔»

«بیٹھیے یہی تو میں تم سے کہنے آئی تھی۔ باہر کچھ ہوا کہے تمیں کیا یہ میں تجھے آج نکلنے نکلنے دوں گی۔» امی نے کہا اور فوراً واپس ہو گئیں۔

باہر نہیں چکر رہا۔ باہر کچھ ہوا کہے، وہ بڑی طریقہ ایسا۔ باہر کچھ نہیں ہو رہا۔ سب کچھ یہ سے بالکل ہیک، باہر کچھ ہوا کہے۔ ہو رہا ہے کہ صدد روانے میں پڑا۔ مالا کھل چکا ہے اندر پوچھا ہے۔ وہ سب جو ہو چکا ہے۔ ہو رہا ہے کہ صدد روانے میں پڑا۔ مالا کھل چکا ہے چھوٹی بزری انسان ویران ہے۔ قدموں کی آہٹی صرف اس وقت سنی جاتی ہے جب کسی گھر سے کوئی جنازہ نکلتا ہے۔ اس کے بعد پھر شاٹا جوز یادہ گرا ہو جاتا ہے۔ کیا روپ نگہم آدمیوں سے خالی ہو جائے گا۔

» بیٹھے ناصر علی! داپنور سے آئی ہوئی بیلی تم نے والپس کر دی، اچھا کیا مگر تمہیں پتہ ہے کہ صحیح سے اپنے تک لئتے گھر غالی ہو چکے ہیں اور کتنے خنازے نسلک چکے ہیں۔«

» اور جب اعلیٰ والی حوصلی میں آگ لگی تھی اور روپ ٹکر کے سارے سبق اپنی مشکلیں لے لے کر آگئے تھے مگر پانی میں مٹی کے تیل کی تاثیر تھی کہ مشکل انڈیلے جانے کے بعد آگ کی پلٹیں اور تیز ہو جاتی تھیں۔«

چھ میگوں تباہ کرتے لوگوں کو حکم بندے علی نے غصہ سے دیکھا «میں کہتا ہوں کہ کسی باہر والے کو کیا پڑی تھی کہ آکر آگ لگاتا۔»

» پھر کس نے لگاتی ہے؟«

» لوگوں ایسا منہ مت کھلوا تو جانزادے کے جھگڑے نے اس خاندان کا شیرازہ بکھر کر رکھ دیا ہے۔«

» ذاکر ہے مجھے ڈر لگ رہا ہے، یاں سے چلیں۔«

» سلوتو بہت ڈر پوک ہے، ابھی چلتے ہیں۔«

» مجھے ڈر لگ رہا ہے، چلیں یاں سے۔«

دھماکہ اگر تھی ہوتی چھت کی کٹ دیاں ایسے جل ہی تھیں جیسے بن کی لکھڑی جلتی ہے۔

» آگ بھانے والا بخون آگ لیا ہے۔«

» آگ بھانے والا بخون؟ اس نے جنگلوں سے والپس آتے ہوئے کسی قدر چونکہ پوچھا۔

» اس نے اگر ختوٹی دیا بخون اور ندا آتا تو آس پاس کے گھر بھی لپیٹ میں آجائے اور ہمارا گھر بھی کون سا الگ تھا کہ تھے۔« یہ کہتے کہتے لٹک پاؤں والپس ہو گئی جیسے بس اتنی بخوبی

ہی آتی تھیں۔ مگر پھر کچھ سوچ کر رکیں «ذاکر اتمہارے نشچاتے بناؤ؟»

» چاتے؟ اس نے چونکہ کرمی کو دیکھا «نہیں اسی» اور ساتھ ہی انھوں کھڑا ہوا۔

امی نے اسے شک بھری نظروں سے دیکھا «اب سے ہے یہ رے آتے ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔»

«بس میں چل رہا ہوں۔»

«کیا کہا،» امی تقریباً پچھے پڑیں «تیری مت ماری گئی ہے۔ آج کوئی نکلنے کا دن ہے۔»
«امی! خواجہ صاحب نے بہت تاکید کی تھی۔ ایا جان کی قبر پڑھ گئی ہے۔ قرشان جائیہ

چکھ اس کا بند و بست کروں۔»

امی یہ سن کر ڈھیلی پڑ گئیں، مگر پھر بولیں «بیٹھے! یہ کام کل بھی ہو سکتا ہے۔»

«کل! امی آپ کو کل پہ بہت اغیار ہے۔» اس نے مال کو گھور کے دیکھا «ہو سکتا ہے

کہ کل کا دن آج کے دن سے بھی زیادہ حزاب چڑھے۔»

امی بالکل ہی ڈھے گئیں کوئی جواب بن ہی نہ پڑا۔ اور وہ تیری سے جوتا پہن یا ال

درست کر کے باہر نکل گیا۔

دروان سے پہ ہی خواجہ صاحب سے مل بھڑا ہو گئی ہی میں تو تمہارے پاس آ رہا تھا۔

تم کہاں جا رہے ہو؟»

«آپ نے کل کہا نہیں تھا، قرشان جا رہا ہوں۔»

«مگر،» خواجہ صاحب نہیں لمحے میں بوئے «کیسے با و گے۔ اُھر تو بہت گریٹر ہے۔»

« نہیں۔ چلا جاؤں گا۔»

خواجہ صاحب کے پھر لوئے ہماری مانو تو آج مت جا قدر کل چلے جاتا۔»

« اچھا میں تو ای ہی کو خوش فہم سمجھ رہا تھا۔ خواجہ صاحب آپ بھی اسی گمان میں ہیں

کہ کل اچھا چڑھے گا۔»

خواجہ صاحب پیٹا کر چپر ہو گئے پھر حتم کی شفقت بھر سے لمحے میں بوئے!

پہنہ نہیں تھیں یہ یات کیسی لگتی ہے مولانا صاحب کے اٹھ جلتے کے بعد میں شاید تم پر

کچھ روک ٹوک کرنے لگا ہوں۔ یا شاید کہ امت کی جگہ میں اب تھیں۔» خواجہ صاحب

کی آواز تھوڑی بھرگئی۔ فقرہ پورا کہتے سے پہلے ہی چپ ہو گئے۔

اس نے خواجہ صاحب کو دلاسادیتے کی کوشش کی «آپ تو مایوس ہونا جانتے ہی نہیں ہتے۔ آپ یہ کسی باتیں کر رہے ہیں۔ بھاں اتنا انتظار کیا ہے اور تھوڑے دن انتظار یکجھے۔ کیا جترکہ۔ ماں اور کیا؟ برسوں بعد یہی لوگ آئے یکجھے گئے ہیں۔ ایک صاحب کو تو میں یہی جانتا ہوں جو کہاں کہاں کے دھکے کھلتے انہی دنوں ہیاں پہنچے ہیں۔»

«پتر!» خواجہ صاحب مایوسانہ لجھے ہیں بولے «آنے کا ویلا گتہ ریگا۔ اور اب کوئی ہیاں پہ آتے بھی تو کیا لے گا۔ دیکھو نہیں رہے، ہو کیا ہو رہا ہے۔ مولانا صاحب اپنے رہے کہاں سے چلے گئے، رکے سوچا، بولے «جاپتیر تجھے نہیں روکتا۔ مولانا صاحب پر لیشان تھے۔ پر جب والپس آجائے تو مجھے بتا جانا کہ اٹھینا ہو جائے۔»

اس پتلی سڑک سے گزرتے گزرتے وہ ٹھٹھے کا امی ٹھیک کرتی تھیں۔ اسے اس وقت یہ احساس ہی نہیں ہوا تھا کہ آگ پھیل بھی سکتی ہے اور جماں لگی تھی وہ جگداں کے گھر سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اس پاس کے کتنے ہی گھر شعلوں کی ندیں آکھہ کاٹے پڑ گئے تھے۔ فائدہ بریگیدیا یا کھڑا تھا۔ اس کالباموٹا پاپ سڑک سے گزر کر اس جل پھنکی عمارت کے اندر چلا گیا تھا۔ جو اپنی چھت سے ٹردہ ہو کے کاٹے کاٹے سلکتے یہ سے بھر گئی تھی۔ دور نہ دیک لوگ اکٹھے تھے اور نک رہے تھے۔ جل ہوئی عمارت کو، پتلی کے خود سروں پہ منڈھے فائدہ بریگیدیڈ والوں کو۔

وہ نظری کی دوکان کے سامنے سے گزرتا ہوا جو بند پڑی تھی۔ سڑک پر آیا جو دوسرے خالی نظر آرہی تھی۔ خالی اور فاموش۔ بیچ سڑک پر چڑلیوں کا ایک تافلہ اُترہ ہوا تھا کہ قابوں کی آہستہ پر چونک کچھ تجھ سے اسے دیکھا اور بھرا کھا کر اڑا گیا۔ آگے تھوڑے فلصلے پر ایک بچیلے سڑک میں پہنچیا تھے مٹل رہی تھی۔ قدموں کی چاپ پر ٹھٹھلی، کوں کوں تھی دیدوں سے اسے دیکھا اور پوچھی۔ میں ایک بچھپڑا دبا کہ اڑ گئی۔ پھر دو تک سڑک پا لکل

”وہ بھی قرستان ہی کی طرف جا رہے ہیں۔“

”قرستان کی طرف ہا۔۔۔ وہ کیوں؟“

”قرستان کے قریب جو لال بلڈنگ ہے وہاں مورچہ لگا ہوا ہے۔ یہ اس پر ہے بولیں گے۔“
”یہ تو بہت مشکل آپڑی ہے، کیا کیا جائے؟“

”صرفی ہے کہ اسی رستے سے جاؤ؟ کسی دوسرے رستے سے چلے جاؤ۔ یہاں سے
اگر تم چرچ والی سڑک پر مڑ جاؤ تو وہاں سے گلیوں میں سے ہوتے ہوئے قرستان تک
پہنچ سکتے ہو۔“

”لہاں یہی ہو سکتا ہے۔“

گھر یہ نہیں ہو سکا۔ اور گرد، یحوم اس قدر تھا کہ وہ بالکل پھنسا ہوا تھا۔ ایسے چل رہا
تھا جیسے سیلاپ میں تنکا بہتنا چلا جاتا ہے اس تھے چار گی کے ساتھ اور گرد کے چھروں
کو دیکھا۔ رکا کہ کھنچ کر لمبے ہو گئے ہیں۔ پھر چلٹے ہونے کے لئے کھنچی گردیں، چلٹے چڑھنے مزدہ مرخ،
اور بدن چلیسے پوڑے بدن پر بال کھڑے ہوں۔ وہ ڈرا۔ کہیں گہرے قریب پھنختی کھنچتی اور پھرے
چلٹے ہوتے ہوئے ان کی صورتیں بالکل یہی تبدل جائیں یا صورت سے یہ صورت ہو جائیں کیا
میں ان میں سے ہوں؟ ان کے ساتھ اٹھایا جا گئے گاہے۔۔۔ نہیں! پھر مجھے اعلان کرنیا پڑا ہے
اعلان اس، یحوم میں ہنسنے کا کون؟ کان پیٹھی اور تو سنا تی نہیں دے رہی۔ کم از کم مجھے
ان کے ساتھ نہیں چلتا جائیں۔ وہ قرستان اپنے رستے سے جائیں، میں اپنے رستے سے
مجھے اس یحوم سے جلدی نکل جانا چاہیئے۔ مبادا میں بھی۔۔۔ میری بھی گرد میں اور چڑھے
چلٹا ہوتا چلا جلتے اور گلے کی ریگن چھوٹ جائیں اور میری صورت۔۔۔ دفعتاً ایک شور
اٹھا۔ گولی چلنی شروع ہو گئی تھی، چھلک، لغزے، گالیاں، بستی ہوئی اینٹیں چلتی ہوئی
گولیاں۔ ایک بڑک تیزی سے اس کے برا بر سے گزرا جس پر کھڑے ہوتے کھنچی ہوئی گروں
اور لمبے چلٹے ہوتے پھرے والے جوانوں کے ہاتھوں میں لپٹوں تھے کہ رُخ ان کا سامنے

نظر آتی ہوئی لال بلڈنگ کی طرف تھا۔ اسے عجیب لگا کہ اس بلڈنگ کی اوپری چھت پر کھڑے اور سچلی منزلوں کے درج پھول سے جھانکتے ہوانوں کی گرد نہیں بھی جیسے اپانک کھنچ گئی ہوں اور پھر سے چھپتے اور لمبے ہوتے چلتے جا رہے ہوں۔ وہ بھی اسی طرح پستلوں سے مسلح تھے گولیوں کا بیٹہ بر سے رکا۔ بھگدڑا، پیچھے دیکار، غیر انسانی پیچھوں کا ایک طوفان۔ وہ طوفانی ہروں پر ہتنا ایک تنکا۔

جلنے کیسے اور کتنی دیر بعد کسی قبر اوسان درست ہونے پر اس نے دیکھا کہ وہ قیرستان کے دروانے پر گرا پڑا ہے مجھے اندر چلنا چاہیئے کہ قبروں کے پیچ اس رستاخیز سے محفوظ رہوں گا۔ گمراہ پر اندر داخل ہو گیا اور قبروں کے درمیان چھٹتا پھر۔ رکا۔ ”بہ ہے ابا جان کی قبر“، وہ قبر کے کنارے بیٹھ گیا۔ یہ سوچ کر کہ اوسان بجا ہوں تو فاتحہ پڑھی جائے ایجھی تو اس کی یہ حالت تھی کہ سالمن و ہوئکنی کی طرح جل رہا تھا اور بدن کا نیپ رہا تھا۔ گولیوں کی آواز بیان تک آرہی تھی۔ نعروں کا شور۔ بھی۔ مگر اب نفرے کہاں رہتے تھے۔ اب وہ غیر انسانی و خیانت پیچھوں کا ایک ایسا لامتحا اور یہ دھوکا کیسا ہے؟ اس نے چونک کہ سامنے عمارتوں سے اپر فضایں نظر دوڑا تی جہاں دھوئیں کے کامے اور جھوڑے بادل سے امداد ہے تھے اور پھر ایک کالی سی موٹی سی لکیر بن کر بلندی کی طرف جا رہے تھے۔ ”آں“، وہ ڈرے سمجھے لجھے میں بڑھا گیا۔ اب دھوکا قیرستان کی طرف اکٹھا تھا اور پھر جنہیں پورا قیرستان دھوئیں سے پھر گیا ہو۔ قبروں کے پیچ بیٹھا ہوا وہ دھوئیں کے پیچ آگینا تھا۔ سالمن سے بڑھ کر اس کے حوالے دھوئیں کی زدوں میں تھے۔ اس کے تصور میں پورا شہر جل رہا تھا۔ ان کی دمین مشاہید بھی ہوئی تھیں اور جھبٹوکی طرح شہر میں پھر رہی تھیں، دہنڑا۔ پھر جلتا شہر کتنا پکھ جل چکا، کتنا کچھ جل رہا ہے۔ عملاً تین کتنی ڈھنے کی تھیں اکتنی ڈھنے پڑنے کو ہیں۔ اس نے رینگ رینگ کر ملے کے تند سے نکلنے کی کوشش کی۔ اسے لگا کہ وہ اکھٹا نہیں ہے۔ یہ میں ہوں یا میرا بلبے؟ کیا عمارت ہمتوں نے ڈھانی ہے؟ میں بھر گیا ہوں؟ میرے ادگرد

حالی۔ اس سلسلے میں اسے اپنے قدموں کی چاپ کتنی اوپری محسوس ہو رہی تھی اور کانوں پر کتنی بار بیٹی ہوئی تھی۔ آگے بند باذ اسکے پیچ دوڑک اینٹیں بھری، ہوتی تھیں کاروں کے شیشے، موڑ کا ایک ٹانہ جو آدھا جل کرنے لجھ گیا تھا۔ اس کے قام کہ تیز ترزاً ٹھاہے تھے۔ کچھ روکنے لگے۔ کچھ تماں۔ یہاں کچھ ہوا ہے اور یہ دھیان میں لاتے ہوتے کہ کیا کچھ ہوا ہو گا اسے اچانک لگا کہ اسے کوئی دیکھ رہے ہے۔ اس نے دایکنیں یائیں نظر ڈالی۔ دکانیں سب بند تھیں۔ مگر ان کے کنارے کنارے پولیس کے سپاہی لاٹھیاں تھامے قطار در قطار کھڑے تھے، بالکل ساکت۔ صرف ان کی نظریں حرکت میں تھیں کہ آتوں جا توں کا تعاقب کر رہی تھیں۔ مگر اسے جلتے کون تھے؟ اس وقت آتوہ اکیلا ہی چل رہا تھا۔

آگے رستہ ڈراوٹا ہوتا جا رہا تھا۔ غاموشی کے منطقے سے نکل کر وہ شودہ منطقے میں داخل ہو چکا تھا۔ کہیں قریب ہی نعروں کا شورستائی دے رہا تھا اور دھواں اُختنا دکھاتی دے رہا تھا کیا کہیں اگلے لگی ہے۔ نہیں، میرے خیال میں کسی نے طاہر جلا یا ہے۔ مگر خیر ملکیہ بچھے کچھ اور سوچنا چاہیتے۔ قرستان یہاں سے اب کتنی دور ہے۔ سر زندگی کا خط پیش نہال میں۔ لکواں کرتا ہے۔ مگر اس سے آگے وہ نہیں ہو چکا۔ بغل کی سڑک سے ایک سیلا بائیڈا چلا آ رہا تھا۔ دوسرے بھے اس نے اپنے آپ کو جو مکے پیچ پایا۔ تھے ہوتے پھرے، آنکھوں میں خون اُترتا ہوا، گرد توں کی ریگیں چھوٹی ہوئیں، بیوں پر نمرے اور گالیاں۔ کون لوگ پیں یہ سب پھرے اس کے لئے اجلبی تھے۔ دیر بعد اجنبی چھروں کے سیلا ب سے ایک آشنا صورت اُبھری اور اسے دیکھ کر ٹھہری۔

”تم بھی جلوس کے ساتھ ہو؟“

”نہیں۔“

”پھر تم ان کے ساتھ کیوں جا رہے ہو۔“

”میں ان کے ساتھ نہیں جا رہا۔ میں قیرستان جا رہوں۔ والد کی قریب۔“

سب کچھ بکھر جیتا ہے۔ وقت یعنی۔ اس ایک وقت کے بطن میں اتنے وقت تھے میں ٹوٹ پھوٹ کر کن کن وقتوں میں بھلکتا پھر رہا ہوں تاگر جل چکا پسہ دیں اسی پر کار سلگ رہی ہیں۔ تم اپنی سلگتی پونچوں کو کماں لے جائیں۔ پترا نہیں مت میں رکھ لوا۔ رکھ لیا۔ ہماری پونچیں ہمارے دانتوں تک جیجھے اور تالوں کے پیچھے ٹھنڈی بڑھ چکی ہیں پر تمارے مند کس کارن کا لے ہو گئے ہیں۔ ہر آگ کا نت کا لک ہے تب میں نے اس رو سیاہ سے پوچھا کہ اے بیاہ رو سیہ نخت ای تیری مان تیرے سوگ میں بیٹھے۔ کیا تو بھی رفعہ لکھنے والوں میں تھا۔ سر جھکا کہ بولا پھلا مکتوب میں نے ہی کھا تھا کہ فصل تیار ہے۔ باعوں میں شکو فی پھوٹے ہوئے ہیں، انگروں کی بیلیں، انگروں کے خوشوں سے لدی ہوئی ہیں۔ پھر میں نے سب سے پہلے اس کے ایچی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ پھر اس کے بعد تھے کیا ہو گیا مجھے نہیں شہر کو، اور اس نے سرگوشی میں کھا کہ اے اخی آہستہ بول بلکہ مت بول کہ سروں کی فصل پک چکی ہے اور کوئی میں کہ فیو نکھڑو ہے کوئے میں کہ فیو امیں ہی ان ہوا اور کوچہ کوچہ پھر لکھے ویاں، گلیاں سنسان، در پچے بندے دروازے مقفل، مسجد ہوئی کرتی تھی سوہ چب امامت کے لئے سکھڑا ہوا تھا اور نمازی صفت بصفت صحیح مسجد کی آخری حل تک کھڑے تھے۔ جب سلام پھیرنے کے بعد اس نے مرکے دیکھا تو صین صاف، مسجد خالی سوہ مسجد میں نمازوں کے جلوں میں داخل ہوا تھا اور اکیلا مسجد سے رخصت ہوا۔ خالی گلیوں اور سنسان کو چوں میں بھلکتا پھر۔ باعوں میں شکو فی پھوٹے ہوئے تھے۔ انگروں کی بیلیں انگروں کے خوشوں سے لدی ہوئی تھیں اور سروں کی فصل پک چکی تھی۔ مت بول بیاد اتم پھانے جاؤ۔ تب کو تم بدھنے زبان کھوئی کہ ایک لگنی میں ایک شیر رہتا تھا۔ رت ایسنت کی، رات پور نماشی کی۔ شیر اپنے بالک کے شگ جنگل میں منتقل مانا تھا۔ ایک بار ایسا دہلاتا کہ جنگل سارا گونج گیا۔ اس کی دہلات کو سن کے گیدڑوں نے عجی بھر جھری لی۔ گلا پھاٹ کے پیچھے دپکار کرنے لگے۔ دیگر دیگر دپکار کرتے رہے۔ سارے بن کو سر پر اٹھا لیا، پہ شیر چپ رہا۔ اس کے بالک نے کہا

کہ ہے میرے پتا! تو اتنا جیا لا جھل کاراچہ پر اچنپے کی بات ہے کہ گیدڑا اس بالوں رہتے ہیں اور تو چپ ہے شیرولا کہ ہے میرے پتا! ایک بات اپنے پتا کی انٹی میں باندھ رکھ کر جب گیدڑا بولتے ہیں تو شیر چپ ہو جاتے ہیں۔

یہ جاتک میں ایک بھکشو بولا کہ ہے تھا گست یہ کس سے کی بات ہے۔ مسکاتے اکا کہ اس سے کی جس سے میں سنگ کے جنم میں آیا تھا اور بنارس سے پرے ہمالیہ کی لمبی میں پاس کرتا تھا، راہل میرے سنگ تھا۔

یہ کہ کے بدھ دیوجی چپ ہو گئے بلیتے چپ رہے تو بھکشو دیدا میں پڑ گئے کہ کہیں پھر چپ ہوتے کام سے تو نہیں آگیا۔ بجہ دانا چپ ہو جائیں گے اور جوتے کے تسمیے باتیں کہیں گے یہ جوتے کے تسموں کے باتیں کرنے کا وقت ہے سومت بولومیا ادا تم پہنچلتے جاؤ۔ وہ بولے اور پھپتے گئے اور سروں کی فصل کٹتے لگی جب میں نہ کرنے کے پھنچاتاں گھنے درخت کی شاخیں سروں سے لدی ہوئی تھیں کئے ہوتے سمجھے دیکھ کر کھلکھلا کے مہیے اور پکے پھلوں کی مثال نہ بین ٹپ ٹپ گئے گئے میں ڈراہیں میرا سمجھی کو نہیں پک چکا ہے۔ قبلہ اس کے کہ پھل شاخ سے گردے میں نہ بین کو دیکھا۔ غوطے کھاتا چلا جاتا تھا کہ کنارہ آگیا۔ میں نہ سے نکلا اور شہر کی طرف چلنے کی مٹھانی۔ لگہ وہاں کوئی سواری ہی نہیں تھی۔ لیس شینڈ ویران پڑا تھا۔ نرکشا، نہ لیکسی۔ کوئی پرایمیوریٹ کا ریجھی چلنی نظر نہیں آئی۔ میں نے ایک لانگیر سے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ کوئی سواری نظر نہیں آ رہی۔ وہ بولا کہ آج شہر میں ہر قدم ہے۔ سب سواریاں معطل ہیں اور سب بانارینہ ہیں۔ میں پیدل چل پڑا۔ چار قدم چلا تھا کہ ایک جلوس نے آیا۔ بہت بڑا جلوس تھا۔ آدمی ہی آدمی سروں کا ٹھانٹھیں باتا سمندر۔ لگہ سر ہیں کہاں؟ میں نے غور سے دیکھا کسی کے سر نہیں تھا۔ ان کے سر کہاں گئے؟ اور میرا سر کہیں وہیں تو نہیں رہ گیا۔ نہ سن لکھنے کے بعد یہ تو جیاں ہی نہیں آیا تھا کہ دیکھ تو لوں کہ سرسلا مت لے آیا ہوں یا کھو آیا ہوں۔ میں نے دلوں ہاتھوں سے سر کو چھو کے

دیکھا اور اسے گردن پر سلامت پایا۔ شکر خدا کا بجا لایا۔ گرمی قیامت کی تھی۔ وَقَاتَ الْبَشَرِ
 حَذَابَ الْمَأْسَارِ۔ سورج سوانح سے پہ آچکا ہے اور کھوپڑیاں ہنڈیوں کی طرح پکے ہی
 ہیں۔ مرکج دیاں دوشیں ہیں۔ لپچے رہے وہ جنوں نے اس و بال سے نجات پالی۔ میں بھی اپنا سر
 وہیں چھوڑ آتا تو عافیت یہیں رہتا۔ جو سر کھتے ہیں اور سر کے اندر مغز رکھتے ہیں وہ آج مشکل
 یہیں ہیں وہ جو سر کے اندر مغزا اور منہ کے اندر زہان رکھتے ہیں وَالْعَصْمَانُ أَلَا شَانُ لَهُ حُسْنٌ
 شام کا وقت ہے۔ چلتا ہوا دریا ٹھہرا، خیجے جل پکے۔ آنک بھی ہوتی ادھر، ٹوٹی ہوتی ملابا و مهر۔
 کوئی کوئی فنات جلتی رہ گئی ہے۔ اس کی روشنی میں میں نے دیکھا کہ لاشوں کے سر نہیں ہیں۔
 سران کے کہاں ہیں۔ یا انہی وہ نیزوں پر چڑھاتے گئے۔ اب تو انہیں دمشق کے دربار میں
 دیکھے گا۔ جوست کے تسبیح بولتے ہیں۔ بولنے والے کام سرطشت ہیں ہے۔ اے عزیزہ! اب شہر کی
 کیا خبر ہے؟ یا انہی اب سر کھانے والوں کے سر کاٹ کر دربار میں لائے جاتے ہیں اور ایک
 لکھنگوڑاٹک کے اندر داخل ہوا اور منہ سے باہر آیا اور پھر ناک کے اندر۔ طشت میں رکھا
 ہوا یہ سراس شفی کاہے جس نے وہ مبارک سر کاٹ کر نیز سے پرچڑا چایا اور طشت میں رکھ کر
 دربار میں پیش کیا۔ اس دربار میں کتنے سرطشت ہیں رکھ کر پیش کئے گئے۔ کتنے پیش کئے
 جائیں گے۔ تب داؤد کے پیٹے نے اپنے پیٹے کاہکہ میر سیٹے جو طیڑھا ہے اسے سیدھا
 نہیں کیا جاسکتا۔ جو سرگئے وہ اپچھے رہے، جوزندہ ہیں وہ بدلتیں ہیں۔ سب سے بدلتیں
 وہ ہیں جو پیدا ہوں گے۔ اے آنے والے الگ تیراگزہ شہر مبارک سے ہوا ہے تو وہاں کا
 حال بیان کرہے تا قہ سوار رویا۔ اے انہی دیاں کا احوال مت پوچھ۔ اس مرد دلیر کی لاش تینون
 تاک شہر مبارک کے وسط میں سولی پٹنگی رہی۔ تب اس کی ماں گھر سے نکلی۔ اس قام پر آتی،
 فنڈ کی مٹنگی لاغن کو دیکھا اور بولی کہ میر سے شہسوار ابھی تیرا سواری سے اُنت نے کا دقت نہیں
 آیا ہے۔ شہر میں اب امن ہے۔ دنا چیز ہیں فصلیں کٹ پکیں متروں کی فصل، عصمتوں کی
 فصل کتنے پکے بھوک ہیں تیڑ پکر اور پیاس سے بلبلہ کہ مر گئے۔ کتنی گودیں غالی ہو گیں۔